ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

ابی قوریت

ابیقور (۳۴۱-۲۷۰ ق م) ایتھنیا کا رہنے والا تھا اس نے ۳۰۶ ق م کے قریب اپنے باغ ہی میں ایک قسم کی درس گاہ قائم کر لی۔ سکونِ قلب اور لذت پرستی کے فلسفہ کے لیے باغ سے بہتر اور کیا جگہ ہو سکتی ہے بقولِ حافظ

فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے دو یارِ زیرک و از بادۂ کہن دو منے

اس درس گاہ میں یارانِ زیرک و سکونِ قلب کا اچھا خاصا مجمع معلوم ہوتا ہے لیکن ذوقِ کتاب کی تربیت کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں۔ طبیعیات اور ریاضیات و ہیئت و منطق میں دماغ پاشی کو وہ ایک بیکار بلکہ مضر شغلہ سمجھتے تھے۔ یہ زیادہ تر خوش گوار گفتگو کا اڈا تھا۔ نسل و رنگ، زن و مرد اور آقا و غلام کے امتیازات سے یہ صحبت بلند تر تھی۔ اس میں بڑے بھی شریک ہوتے تھے اور چھوٹے بھی، آقا بھی اور غلام بھی، عورتیں بھی اور مرد بھی۔ رندوں کے مے کدے اور صوفیوں کی خانقاہ کی طرح یہاں بھی مساوات ہی سب کا مشرب تھا۔ یہاں کوئی باقاعدہ استادی اور شاگردی کا تعلق بھی نہ تھا اگرچہ ابیقور اس کے اندر مرکزِ عقل اور قبلۂ احترام تھا۔ اس کے پیرو اس کو ایک برگزیدہ پیر سمجھتے تھے اور ان سب کو یقین تھا کہ اسی ہستی کے ذریعے سے پہلے پہل حقیقتِ حیات بے نقاب ہوئی ہے اور نوعِ انسان توہمات کی ظلمتوں سے نکل کر ہدایت کے نور کی طرف اسی تعلیم کی بدولت آسکتی ہے جس طرح مذہبی پیشواؤں کا احترام اس درجے تک پہنچ جاتا ہے کہ ان کی ہر حرکت سند ہو جاتی ہے اور ان کے ایک ایک لفظ کو لوگ سن کر یاد رکھتے ہیں اور زندگی کی ہر تفصیل میں اس کو مثال سمجھتے ہیں، ابیقور کے پیرووں کے دلوں پر اس کا کچھ اسی قسم کا سکہ بیٹھ گیا تھا۔ یہ مذہب صدیوں تک یونانیوں اور رومیوں اور قریب کی دوسری اقوام میں بھی جاری رہا لیکن ابیقور کی تعلیم پر نہ کچھ اضافہ ہوا اور نہ کسی نے ردّ و بدل کیا اس کے اندر آخر تک ابیقور کی سند کافی شمار ہوتی۔

لذتیت کا فلسفہ کوئی جدید فلسفہ نہ تھا۔ سقراط کے بعد سیرینیوں نے یہی مسلک اختیار کر لیا تھا اور اس کو سقراط کی صحیح تعلیم سمجھتے تھے۔ ابیقور بھی سیرینیوں کے امام ارسٹپس کی طرح لذت کو خیرِ برترین اور مقصودِ حیات

قرار دیتا ہے۔ نیکی بھی خیر ہے لیکن مقصودِ اصلی نہیں۔ اگرچہ نیکی لذت کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے اور اس کو بطور وسیلہ اختیار کرنا چاہیئے، خیرِ برترین نیکی کی اپنی ماہیت میں داخل نہیں۔ ارسٹپس کی تعلیم اور ابیقور کے فلسفے میں یہ فرق ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ارسٹپس کی لذت طلبی ایک نہایت سادہ سی بات تھی لیکن ابیقور کے ہاں لذّت کی ماہیت پر غور کرتے ہوئے یہ فلسفہ بہت لطیف ہو گیا ہے۔ ابیقور کا فلسفہ یہ نہیں کہ جہاں سے جس قسم کی لذت جس حالت میں مل جائے وہ قابلِ آرزو اور قابلِ طلب ہے۔ وہ زندگی کے عملی تجربے کی بنا پر لذتوں کی بہت سی قسمیں قرار دیتا ہے اور ایسی لذتوں سے پرہیز کرنے کی تعلیم دیتا ہے جن میں فحاشی ہو اور جو اعتدال سے بڑھی ہوئی ہوں۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہے کہ لذت کی طلب سے لذت حاصل نہیں ہوتی۔ شہوات کے ساتھ جو لذتیں وابستہ ہیں، ابیقور ان کی طرف زیادہ متوجہ ہونا ضرر رساں سمجھتا ہے۔ اس کا فلسفہ حقیقت میں اتنا لذت طلبی کا فلسفہ نہیں جتنا کہ سکونِ قلب اور اطمینانِ قلب کا فلسفہ ہے جو طبیعت میں توازن قائم رکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر کوئی شخص کھانے کی لذتوں کا شکار ہو جائے تو ایک طرف وہ لذائذ کی تلاش میں مارا مارا پھرے گا اور سکونِ قلب کھو دے گا اور دوسری طرف معدے کی خرابی سے خود یہ لذت بھی اس کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ جب کبھی اس کو فقط روکھی سوکھی روٹی نصیب ہوگی تو وہ زندگی سے بیزار ہو جائے گا۔ وہ افلاطون کے اس خیال سے بھی متفق ہے کہ ہماری بہت سی لذتیں فقط دکھ سے نجات پانے کا احساس ہوتی ہیں ان کی خود اپنی مستقل ایجابی حیثیت کچھ نہیں ہوتی۔ ایسی لذت کو صحیح تسکین نہیں کہہ سکتے۔ اصلی سکونِ قلب وہ ہے جو دور از کار آرزوؤں کو دبا دینے بلکہ مٹا دینے سے پیدا ہو۔ اگر دل میں یہ بات پیدا ہو جائے کہ جو میسر آ جائے وہی ٹھیک ہے۔ اگر کچھ مل جائے تو خوش اور نہ ملے تو خوش، ایسی ہی حالت حقیقت میں خوش حالی کہلا سکتی ہے:

خوش حال کسانیکہ بہر حال خوش اند

انسان جتنا اپنی آرزوؤں کو بڑھاتا جائے گا اتنا اپنے سکون کو معرضِ خطر میں ڈالتا جائے گا۔ اس کی مثال سمندر کے پانی سے پیاس بجھانے کی کوشش ہے۔ جس قدر پیتا جائے گا اسی قدر پیاس بڑھتی جائے گی۔ خیریت اسی میں ہے کہ جہاں تک ہو سکے انسان سادہ سے سادہ زندگی پر قناعت کرے۔ آرزوئیں اس کو حوادث اور حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں گی اور انسان اپنی آزادی اور اطمینان کھو بیٹھے گا۔ طلبِ لذت جذبات کا ہیجان پیدا کرتی ہے، اسی سے خوف بھی پیدا ہوتا ہے اور حزن بھی۔ لیکن قلب کی بہترین حالت وہ ہے جو خوف اور حزن اور ہیجانِ شہوات سے بالاتر ہو۔ زندگی کا مقصد دکھ سے نجات حاصل کرنا ہے۔

کائنات کے حوادث اور زندگی کے انقلابات پر انسان کا کوئی اختیار نہیں۔ اگر وہ اپنی سعادت اور

بہبود کو حالات کا محتاج کر دے تو ہر وقت حوادث کے تھپیڑے کھاتا رہے گا۔ سعادت ایک باطنی چیز ہے اور جس قدر کوئی شخص خارج سے بے نیاز ہوتا جائے گا اسی قدر اس کی سعادت محفوظ ہوتی جائے گی۔ جب کوئی شخص کسی چیز کو اپنی راحت کے لیے ضروری اور ناگزیر سمجھ لیتا ہے تو زحمت اٹھا کر بھی اس کی طلب میں لگا رہتا ہے۔ وہ چیز اگر دستیاب ہو بھی جائے تو دیکھنا چاہیئے کہ اس کی کیا قیمت ادا کرنی پڑی۔ ممکن ہے کہ طلب میں دکھ زیادہ ہوا ہو اور حصول میں لذت اس کے مطابق نہ ہو۔ زندگی کی اکثر لذتوں میں نشہ بانداز خمار نہیں ہوتا۔ پھر یہ ہے کہ جو کچھ حاصل ہوا ہے حصول کے ساتھ ہی اکثر اس کی لذت ناپید ہونے لگتی ہے اور اگر قائم رہے تو یہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ کہیں ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ جب تک حاصل ہے تب تک کھٹکا لگا رہتا ہے جو اطمینان قلب کے منافی ہے۔ اور اگر وہ چیز ہاتھ سے جاتی رہے تو اس کا غم کھانا پڑے گا۔ اصل چین اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب انسان طبیعت کو ایسا بنا لے کہ بس جو ہے سو ٹھیک ہے۔ انسان اپنے نفس میں ایسی کیفیت پیدا کر سکتا ہے کہ وہ بدن کے دکھ سے بھی بے نیاز ہو جائے۔ مصیبت کو مصیبت سمجھنا ہی اصل مصیبت ہے۔ اگر مصیبت کو مصیبت نہ سمجھیں تو وہ مصیبت نہیں رہتی۔ عام آدمی جس مصیبت پر روتا ہے حکمت شعار آدمی اس پر مسکرا سکتا ہے۔ حصولِ لذت چاہتے ہو تو اس کی طلب میں دام نہ لگاؤ۔ جذبات کو ہیجان سے بچاؤ۔ لذت و الم کے عام اقدار اور اوہام کے متعلق زاویۂ نگاہ کو بدل دو۔ اصل سرور سکون اور بے ہیجانی ہی سے ہے۔

اس بیان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ابیقور کی لذتیت حواس کے خوش گوار احساس سے گزر کر کس قدر زہد اور تقویٰ کے قریب آ گئی ہے۔ جو نسخہ صوفیا عرفان اور عشق الٰہی کے پیدا کرنے کے لیے پیش کرتے ہیں اس سے کس قدر ملتا جلتا نسخہ لذت پرستی کا امام بھی پیش کرتا ہے، جو نہ روح کا قائل ہے نہ خدا کا، نہ آخرت اور ثواب و عذاب کا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کفر و دین کے ڈانڈے بعض مسائل میں کس قدر مل جاتے ہیں۔ خدا پرست انسان کہتا ہے کہ دنیا کے لذت و الم فریب حواس ہیں اور اس کی آرزوئیں دام تلبیس ہیں، آرزوؤں کو کم کرو اور جذبات کو دبا دو تو خدا ملے گا۔ سکون طلب حکیم دہری کہتا ہے کہ سکونِ قلب چاہتے ہو تو وہ شہوات کی پیروی میں نہیں ملے گا۔ طبیعت کو لذت و الم دونوں سے بلند تر کر لو تو اصل عرفان حاصل ہوگا جو اس کے نزدیک اطمینانِ قلب کا نام ہے اس سے آگے اس کا کوئی نصب العین نہیں۔ ایسے سکون طلب ملحد اور زاہد عابد کی ظاہری زندگی میں خارج سے دیکھنے والے کو کچھ زیادہ فرق نظر نہیں آئے گا۔ لیکن حکیم سکون طلب کے نظریۂ حیات اور اندازِ عمل میں کوئی پیکارِ نفس نہیں، کوئی جد و جہد نہیں، کسی نصب العین کے لیے جہاد نہیں، کوئی شجاعت نہیں، کوئی ایثار نہیں۔ یہ سبک سار یہ ساحل زندگی کے تلاطم میں سے موتی نکالنے کا قائل نہیں، جہاں 'حلقۂ صد کامِ نہنگ' بھی موجود ہے۔ دین دار کے ہاں توکل ہے اور اس قسم کے بے دین کے ہاں

قناعت. دونوں تسلیم و رضا کی تعلیم دیتے ہیں لیکن اغراض و مقاصد کس قدر مختلف ہیں۔ ظاہر میں اس قسم کا رندِ بے دین بھی ایک قسم کا صوفی معلوم ہوتا ہے:

رندے دیدم نشستہ بر روئے زمیں   نہ کفر نہ اسلام نہ دنیا و نہ دیں
نہ حق نہ حقیقت نہ شریعت نہ یقیں   در ہر دو جہاں کرا بود زہرۂ ایں

اس قسم کا سکون طلب ملحد اخلاقی جد و جہد کی طرح علمی جد و جہد کو بھی لاحاصل سمجھتا ہے۔ اس کا معیارِ علم کے متعلق بھی یہی ہے کہ علم وہی قابلِ حصول ہے جس سے حقیقی نفع حاصل ہوتا ہو اور یہ حقیقی نفع زندگی کے توہمات اور تکلفات سے چھٹکارے کا نام ہے۔ منفعت بخش علم فقط خیر و شر کا علم ہے لیکن اس غرض کے لیے ہر قسم کا علم مفید نہیں ہو سکتا۔ ابیقوری پوچھتے ہیں کہ منطق اور ریاضیات کی موشگافیوں سے انسان کو کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ دوراز کار علم کے لیے اپنے آپ کو شمع کی طرح گھلا دینا کون سی عقل مندی کی بات ہے۔ انسان ہوا، پانی مٹی اور ستاروں کا علم حاصل کرتا پھرتا ہے۔ دائرے اور مستطیل و مربع کے صفات و اغراض پہ دیدہ ریزی کرتا ہے۔ درآں حالے کہ خود اپنے جسم و نفس کی ضروری معلومات سے بھی بیگانہ ہوتا ہے۔ علم کو علم کی خاطر حاصل کرنا احمقوں کا کام ہے اور ایک قسم کا جنون اور بیماری ہے۔ جس طرح بخیل روپے کو روپے کی خاطر حاصل کرتا اور جمع کر کے خوش ہوتا رہتا ہے اور روپے کا مصرف بالکل بھول جاتا ہے۔ حصولِ علم اور رفعِ جہالت کے لیے جہاد کرنا جو افلاطون اور ارسطو کی تعلیم اور عمل میں پایا جاتا ہے ابیقور کے نزدیک سعی لاطائل ہے۔ اکثر علوم و فنون جھوٹی آرائش اور تکلفات سے وابستہ ہیں۔ ابیقور خود بھی کوئی ایسا عالم نہیں تھا اور دوسروں کو بھی کبھی علمی جد و جہد کی تلقین نہیں کرتا تھا۔ اگر کوئی شخص تھوڑا بہت پڑھ لکھ سکے تو اس کے لیے بہت کافی ہے۔ صرف و نحو کی موشگافیاں کر کے اور تاریخ کے طومارِ دروغ میں سے سچ کو معلوم کرنے کی کوشش میں اس کو کیا مل جائے گا۔ اگر کسی نے ہومر کی ایک سطر بھی نہ پڑھی ہو تو بتایئے کہ اس نے کیا کھویا ہے۔ فلاں لڑائی کس سن میں ہوئی اس میں کون ہارا کون جیتا اس کی کُرید کرنے سے مجھے کیا مل جائے گا۔ ستاروں کی گردش اور ان کے مقامات کو معلوم کر کے میری زندگی پر کیا روشنی پڑتی ہے اور مجھے اپنے خیر و شر کی نسبت اس سے کیا علم حاصل ہوتا ہے۔ علوم و فنون کی نسبت اس کی یہ رائے کچھ اسی قسم کی ہے جو اکثر اہلِ دین میں بھی پائی جاتی ہے جو عبادت اور خدا کے احکام کی پیروی کے علاوہ باقی تمام علوم کو شیطان کا پھندا اور معرفت کا دھندا سمجھتے ہیں۔

ابیقور کے ہاں دینیات اور مابعد طبیعیات کا نام و نشان نہیں۔ لیکن طبیعیات کو وہ ضرور اہم سمجھتا ہے۔ وہ بھی اس لیے نہیں کہ جدید سائنس دانوں کی طرح مظاہر اور حوادث کے قوانین معلوم کرنے سے اس

کو کوئی خاص دلچسپی ہے بلکہ اس لیے کہ طبیعیات کا علم انسان کو مابعد الطبیعیات کے ماورائی مسائل اور دینیات کے بے اساس توہمات سے نجات دلا سکتا ہے۔ لذتیت اکثر مادیت کے ساتھ ہی وابستہ رہی ہے۔ ابیقور کا مذہب بھی مادیت ہے۔ اس کی طبیعیات دیمقراطیسی ہے کہ کائنات میں حقیقی وجود فقط اجزائے لاتتجزا یعنی ناقابلِ تقسیم ذرات اور خلا کا ہے۔ لیکن دیمقراطیس کی طرح وہ مادّہ اور حرکت کے ہمیشہ اور اٹل قوانین کا قائل نہیں۔ مادیت کا وہ اس لیے شیدائی ہے کہ اس کی بدولت انسان کو مذہب کے پنجے سے رہائی مل سکتی ہے۔ اس کے نزدیک خدا اور بقائے روح اور جزا و سزا کے عقیدے سب ہستی کی ماہیت سے ناواقف ہونے کا نتیجہ ہیں۔ اگر مادّے کے قوانین کو بھی اٹل سمجھ لیا جائے تو اس اندھی تقدیر سے بھی انسان اپاہج اور بے بس ہو جائے گا۔ چیزیں ذرات کی کشاکش سے بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں لیکن اس کون و فساد میں محض اتفاق کا عنصر بھی موجود رہتا ہے۔ مذہب نے انسانوں کو عذاب جہنم سے اس طرح ڈرایا کہ زندگی کی نعمتوں سے لطف اٹھانا ان کے لیے ناممکن ہوگیا۔ جب انسان کو یہ معلوم ہو جائے کہ کہیں آخرت ہے، نہ جنت و دوزخ، نہ حساب کتاب تو وہ اطمینان کا سانس لے۔ اس وحشت اور دہشت کا علاج طبیعیات کے علم سے ہو سکتا ہے وہ کہتا ہے کہ دنیا میں اکثر باطنی اور ظاہری خرابیاں مذہب کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ انسان کبھی پوری طرح آزاد نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ مذہب سے آزاد نہ ہو جائے اور یہ نہ سمجھ لے کہ اس کی سعادت تمام تر اس کے اپنے فکر و عمل میں ہے۔ ایک خدا کو نہ ماننے کے دلائل اس نے وہی دیے ہیں جو اکثر منکرِ خدا آج بھی پیش کرتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی ناظم اور عادل اور خیر اندیش ہستی دنیا کو بنانے اور چلانے والی ہوتی تو دنیا ویسی نہ ہوتی جیسی کہ نظر آتی ہے۔ جو کچھ نظم یا جمال اس میں دکھائی دیتا ہے وہ لامتناہی ذرات کے اتفاقی اجتماعات کا نتیجہ ہے۔ لامتناہی اجتماعات میں سے چند اجتماعات ہمارے لیے مفید اور دل کش بھی بن گئے ہیں۔ لیکن ان کے قیام کا کون ضامن ہے۔ جس طرح اندھا دھند بن گئے ہیں اسی طرح اندھا دھند بگڑ بھی جائیں گے۔ برق و باد میں جاہلوں کو خدائے عادل کی مشیت نظر آتی ہے لیکن یہ کیسا عادل و رحیم خدا ہے جس کی بجلی گرتے وقت معصوم اور گنہ گار میں کوئی امتیاز نہیں کرتی۔ بھونچال آتا ہے تو ظالموں کے گھروں کے ساتھ مظلوموں کے گھر بھی گر جاتے ہیں۔ بے پناہ سیلاب بچے اور بوڑھے، شریف اور شریر، ولی اور شیطان سب کو ایک ہی طرح ڈبوتا ہے۔ اس وقت کوئی خدا کسی بے گناہ کو بچاتا ہوا اور اس کی فریاد رسی کرتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ عبادت گاہیں بھی اسی طرح اس کی زد میں آتی ہیں جس طرح قحبہ خانے اور شراب خانے۔ جب یہاں پر عذاب و ثواب کا کوئی معین قانون نہیں ہے تو بھلا آگے چل کر وہ کہاں سے ابھر پڑے گا۔ جب یہاں خدا کا ہاتھ کہیں نظر نہیں آتا تو اگلی دنیا میں جزا و سزا کے لیے خدا کہاں سے آجائے گا۔ اصل میں جہل اور توہم ہی جہنم ہیں۔

اور جو علم اس جہنم سے نجات دلوائے وہ ضروری اور مفید علم ہے۔ خدا اور روح کسی کا کوئی مستقل وجود نہیں اور نہ روح کو بقا حاصل ہے۔ بقا صرف ذرات کو حاصل ہے۔ تغیر فطرت کا قانون ہے۔ زمین، آسمان، شجر، حجر، جاندار، انسان سب فنا پذیر ہیں۔ کئی کائناتیں تباہ ہو کر موجودہ کائنات بنی ہے جب یہ فنا ہو گئی تو ان تھک ذرات کوئی دوسری قسم کی کائنات بنالیں گے۔

ابیقور کہتا ہے کہ جہلا روح کو جسم سے کوئی الگ چیز سمجھتے ہیں جس کے خواص مادی اور جسمانی قوانین سے بالاتر ہیں۔ یہ بھی ایک حماقت کا نظریہ ہے۔ روح اگر جسم سے الگ کہیں اور موجود تھی تو اُس کو اپنی پہلی زندگی کی بابت کچھ تو یاد رہنا چاہیئے تھا۔ ہر ایک کا تجربہ اس کا شاہد ہے کہ روح کا تمام تر مدار جسم کی کیفیات پر ہے۔ غذا اور دوا، تندرستی اور صحت، عمر کے تغیرات یہاں تک کہ موسم کی تبدیلیوں سے بھی روح کی کیفیت بدلتی رہتی ہے۔ ایسی چیز کو کوئی الگ اور مستقل حقیقت کیسے سمجھ لے۔ شراب کا ایک پیالہ پی لینے سے تمام نظریۂ حیات و کائنات ہی بدل جاتا ہے۔ ذرا سی بیماری یا جسمانی حادثے سے روح کی مٹی پلید ہو جاتی ہے۔ یہ سمجھنا کس قدر حماقت ہے کہ جب جسم کا سہارا بالکل مٹ جائے تو بھی اس میں کچھ باقی رہ سکتا ہے۔ جان کے نکل جانے کے بعد جسم کے وزن میں کوئی فرق نہیں پڑتا جس سے گمان ہو کہ کوئی حقیقی چیز اس میں سے نکل گئی ہے۔ جان بس ایک ترکیب کی پیداوار ہے جس طرح ساز کے اندر تاروں کے خاص نظام سے نغمہ پیدا ہوتا ہے جب ساز ٹوٹ جائے گا تو نغمہ کہاں رہے گا۔ تمام علم حواس سے حاصل ہوتا ہے۔ کیا انسان کے پاس کوئی ایسی معلومات بھی ہیں جو حواس سے حاصل نہ ہوئی ہوں۔ جب حواس نہیں ہوں گے تو روح کو علم کہاں سے حاصل ہو گا۔ موت کا خوف بھی جہالت کا نتیجہ ہے جب ہم ہیں تو موت نہیں ہے اور جب موت آئے گی تو ہم نہ ہوں گے۔ جاہل موت سے اس لیے ڈرتا ہے کہ وہ خیال کرتا ہے کہ گویا قبر میں بھی اُس کا شعور باقی رہے گا اور وہ اپنی اس حالت کا اندازہ کر کے بہت گھبراتا اور خوف کھاتا ہے۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ تمام دینیات کو رد کرنے کے بعد بھی ابیقور دیوتاؤں کا قائل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دیوتاؤں کی ہستی کا یقین اس زمانے میں تمام دلوں میں ایسا راسخ ہو چکا تھا کہ خدائے واحد کے منکر ہونے پر بھی دیوتاؤں کا منکر ہونا محال معلوم ہوتا تھا۔ وہ دیوتاؤں کا قائل ہے لیکن اس کے نزدیک دیوتا بھی لطیف مادے ہی کے بنے ہوئے ہیں۔ وہ ہم سے اعلیٰ ہستیاں ہیں لیکن ان کو ہماری زندگیوں سے کوئی سروکار نہیں۔ افلاک کی لامحدود وسعتوں میں وہ مطمئن اور بے ہیجان زندگی بسر کرتے ہیں جہاں ابر و باد کے طوفان اور جذبات کے ہیجان کا نام و نشان نہیں۔ ان کی ہستی سراپا نور و سرور ہے۔ فطرت نے ان کے لیے سب کچھ مہیا کر رکھا ہے۔ انسانوں کے اعمال سے انہیں کیا واسطہ۔ وہ ہماری دنیا کے خیر و شر اور ہمارے ارادوں کی کش مکش سے

مادری ہیں۔ نہ ہماری دعائیں اور خوشامد کا ان پر کچھ اثر ہوتا ہے اور نہ ہماری حرکتیں اُن کے غصے کو مشتعل کرتی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ابیقور کے ہاں نہ کوئی مابعد الطبیعیات یا الٰہیات ہے نہ دینیات نہ نظریۂ علم۔ اصل غرض سرور و سکونِ نفس ہے اس کو سہارا دینے کے لیے جو عقائد بھی اختیار کرنے پڑیں وہ ان کو قبول کر لیتا ہے۔ وہ دیمقراطیس کی ذراتی مادیت کا قائل اس لیے ہے کہ اس کے اختیار کرنے سے مذہب سے نجات مل سکتی ہے۔ لیکن ذرات کی حرکات میں جو میکانکی جبر ہے وہ اس کو تسلیم کرنا اپنے مقاصد کے خلاف سمجھتا ہے۔ اس لیے اس کو قبول نہیں کرتا۔ جبر مادی ہو یا الٰہی اس کے نزدیک آزادیِ نفس کا منافی ہے اور کوئی شخص اپنے آپ کو مجبور پا کر مطمئن اور مسرور نہیں ہو سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ "جبرِ طبیعی کا عقیدہ رکھنا، دیوتاؤں کے متعلق توہمات اور خرافات کو تسلیم کرنے سے بھی بدتر ہے۔ خدا کا قائل انسان اس کے غضب سے، عبادت اور خوشامد کے ذریعے سے اپنے آپ کو بچا لینے کی توقع تو رکھتا ہے لیکن طبیعی فلاسفہ کی اندھی مادی تقدیر پر کوئی دعا عمل نہیں کر سکتی۔ دیمقراطیس کے میکانکی جبر سے بچنے کے لیے وہ ایک عجیب و غریب نظریہ قائم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام ذرات متوازی خطوط میں نیچے کی طرف گرتے ہیں اگر کوئی مزاحمت نہ ہو تو ان کا ایک دوسرے سے تصادم نہ ہوگا۔ لیکن بعض ذرات ناقابلِ فہم اتفاق یا کسی بے سبب اختیار کی وجہ سے خطِ مستقیم سے ادھر اُدھر ہوتے گئے جس کی وجہ سے وہ آپس میں ٹکرا گئے اور کائنات کے اندر مختلف قسم کی حرکتوں کا آغاز ہوا۔ انہی حرکتوں کا نام کون و فساد ہے۔ آزادیِ ارادہ یا اختیارِ بے سبب کا نظریہ ابیقور کے بعد بعض بڑے بڑے اکابرِ فلسفہ نے بھی اپنی اخلاقیات کا اصل اصول قرار دیا۔ مذاہب بھی عام طور پر اس قوتِ اختیار اور احتمالِ بغاوت پر زور دیتے ہیں اور حال میں طبیعیات نے جو جدید نظریات اختیار کیے ہیں ان میں سب سے اہم یہی خیال ہے کہ ذرات کی حرکت میں کوئی قاعدہ قانون معلوم نہیں ہوتا اور مادی اجسام کی حرکت میں جو جبر دکھائی دیتا ہے وہ قانونِ اوسط اور قانونِ احتمال کی وجہ سے ہے۔ لاتعداد ذرات کی اختیاری اور بے اصول حرکتیں ایک دوسرے کو منسوخ کرتی ہوئی ایک اوسط حرکت پر آ جاتی ہیں۔ اور افراد کی تعداد اگر بہت کثیر ہو تو ان کے نتیجۂ اعمال میں یکسانی کا احتمال بہت بڑھ جاتا ہے۔ ابیقور کہتا ہے کہ اگر میں خدائے جابر کا منکر ہوں تو مادۂ جابر کو کیسے قبول کر لوں جو اس قسم کے خدا سے بھی بدتر ہے۔

تاریخ سے اس کی شہادت ملتی ہے کہ ابیقور کا نظریہ اس وقت سے لے کر اب تک خاص قسم کی طبائع کو بہت پسندیدہ معلوم ہوتا ہے۔ انسانی طبائع میں ایک نظری جھول بھی ہے۔ انسان اکثر راحت طلب اور کوشش پسند ہوتے ہیں۔ تن آسانی کو ایک انعام اور جد و جہد کو ایک سزا سمجھتے ہیں۔ اس خیال کو ایک فارسی شاعر نے اس کی انتہائی صورت میں خوب ادا کیا ہے:

بقدرِ ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را ‌‌ دویدن رفتن استادن نشستن خفتن و مردن

یعنی جتنی جد و جہد کم ہو اتنی راحت زیادہ ہوتی ہے۔ دوڑنے میں آرام بہت کم ہے، چلنے میں اس سے زیادہ، کھڑے رہنے میں اس سے زیادہ۔ بیٹھنے میں اس سے زیادہ، سونے میں اس سے زیادہ اور کمال راحت مرجانا ہے جس میں تمام ہیجان ختم ہوجاتا ہے۔ حافظ شیرازی اور عمر خیام کی قبولیت بہت کچھ اسی ابیقوریت کی بنا پر ہے۔ ایک خاص قسم کے تصوف کے بعض عناصر چونکہ اس سے ملتے جلتے ہیں اس لیے ان شعرا کا مجاز بعض اوقات حقیقت کا ہم رنگ معلوم ہوتا ہے۔ ان میں بھی زیادہ تر یہی تعلیم ملتی ہے کہ علم و عمل کی جد و جہد سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، کُنہِ حیات حکمت سے دریافت نہیں ہو سکتی، جنت کی لذتیں دور کے ڈھول ہیں، اس لیے جو سکون اور سرور یہاں مل جائے اس کو غنیمت سمجھو:

برخیز کہ پُر کنیم پیمانہ ز مے ‌‌ زاں پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما

بیا کہ رونقِ ایں کارخانہ کم نشود ‌‌ ز زہدِ ہمچو توئی یا ز فسقِ ہمچو منے

فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے ‌‌ دو یارِ زیرک و از بادۂ کہن دو منے

مَی دو سالہ و معشوقِ چاردہ سالہ ‌‌ ہمیں بس است مرا صحبتِ صغیر و کبیر

ہنگامِ تنگ دستی در عیش کوش و مستی ‌‌ کیں کیمیائے ہستی قاروں کُند گدا را

حدیث از مطرب و مَی گو و رازِ دہر کمتر جو ‌‌ کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

حافظ اور خیام پر جو بعض لوگوں نے ہوس پرستی اور لذت طلبی کا الزام لگایا وہ ویسا ہی غلط اور بے بنیاد ہے جیسا کہ ابیقور کی نسبت۔ یہ لوگ اتنے خام خیال نہ تھے کہ اس بودی بات کی تعلیم دیتے کہ نیکی بدی سب برابر ہے لہٰذا جو جی چاہے کرو اور جس قسم کی لذت جہاں سے چھین سکو چھین لو۔ یہ لوگ نیک تھے اور نیکی کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ لیکن ان کی نیکی مجاہدانہ نیکی نہیں ہے۔ اس کے اندر کسی بلند نصب العین کے لیے ایثار اور جد و جہد نہیں ہے۔ اُن کے ہاں یہی ہے کہ انسان راضی برضا رہے اور سکون و سرور کو کبھی ہاتھ سے نہ کھوئے۔ ان کے نزدیک حکمت اور نیکی کی زندگی ہی مسرت اور سعادت کی زندگی ہے۔ نیکی اور سعادت ایک ہی طرزِ زندگی کے دو پہلو ہیں۔ جو نیک نہیں وہ خوش بھی نہیں رہ سکتا۔ حکمت اور عدل کے ساتھ زندگی بسر کرنا دوسروں سے دوستی اور محبت

مسرّت کا ضامن ہے۔ لیکن ابیقورس کے ہاں سکون و سرور کے علاوہ نیکی کا کوئی اور معیار نہیں۔ ہر وہ عمل حکمت عملی میں داخل ہے جس کے ذریعے سے انسان خوش رہ سکے اور ضرر رساں نتائج سے بچ سکے۔ باقی کوئی عمل فی نفسہٖ خیر یا فی نفسہٖ شر نہیں اور لذت کے سوا خیر و شر کا کوئی مستقل معیار نہیں۔ ابیقور کہتا ہے کہ خیر و شر میں بہت سی چیزیں مصنوعی و رسمی ہیں لیکن عام طور پر جس کو بدی کہا جاتا ہے اس سے پرہیز ہی بہتر ہے کیونکہ بدی کے اگر کوئی ظاہری ضرر رساں نتائج مترتب نہ بھی ہوں تو بھی وہ سکون سوز اور اطمینان کش ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ آرام طلبوں اور تن آسانوں کی اخلاقیات ہے۔ خوش مزاجی اور دوستی، حسن و جمال کا ذوق، قناعت، سکون اور سرور سب اچھی چیزیں ہیں لیکن یہ اخلاقی زندگی کا پورا سرمایہ نہیں۔ اس کے اندر ایثار اور شجاعت اور مقاصدِ عالیہ کے لیے جدوجہد بھی لازمی اجزا ہیں۔ جدوجہد علم و فن کے لیے بھی ضروری ہے اور تنظیم حیات کے لیے بھی زندگی کے اندر ہر جگہ اعلیٰ انسانی اقدار کو خونِ جگر سے خریدنا پڑتا ہے۔ جو شخص محض سکون اور لذت ہی کا طالب ہے وہ انسانیت کے اعلیٰ جوہر سے محروم رہتا ہے۔ اگر سکون طلبی ہی سب سے بڑا شرف ہوتا تو جمادات اور نباتات اور تمام حیوانات انسان سے اشرف ہوتے۔

ماہنامہ میثاق لاہور

تقطیع
۲۰ × ۲۰ / ۸

زیرِ ادارت

ضخامت
۵۶ صفحات

مولانا امین احسن اصلاحی

اسلام پر بلند پایہ علمی و تحقیقی مضامین کے علاوہ مولانا اصلاحی کی تفسیر تدبر قرآن اور تزکیہ نفس کا سلسلہ مضامین میثاق کی نمایاں خصوصیات ہونگی

سالانہ چندہ چھ روپے — قیمت فی پرچہ دس آنے

پہلا شمارہ شائع ہو چکا ہے

مراسلت و ترسیل زر کا پتہ: مینیجر ماہنامہ میثاق رحمان پورہ اچھرہ لاہور